

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اشارات

گزشتہ ہفتے مجھے اپنے چند دوستوں کے ہمراہ ایک ایسی جگہ سے گزرنے کا اتفاق ہوا جو چند سال پیشتر بالکل ویرانہ تھا مگر اب وہاں جدید ڈیزائن کی بیٹھار سرسبز عمارتیں کھڑی ہیں۔ شہر کے اس خوبصورت حصہ کو دیکھ کر کوئی انسان ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ یہ قطعاً ارضی پاکستان جیسے پس ماندہ ملک کا کوئی ٹکڑا ہو سکتا ہے جس کے بسنے والوں کی اوسط آمدنی دس آنے یومیہ ہے۔ پاکستان کے اس فیشن ایبل حصہ کی دولت شہرت پر توجہ کرتے ہوئے میرے ایک رفیق نے کہا "ملک نے چند سالوں کے اندر حیرت انگیز ترقی کی ہے" اس پر دوسرے صاحب نے جو تاریخ اور اسلامی علوم کے ایک بہت بڑے عالم ہیں فوراً فرمایا "حضور یہ ترقی نہیں بلکہ تنزلی کی علامت ہے۔ یہ عمارات ملک میں غیر عادلانہ تقسیم دولت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ انہیں دیکھنے سے ایک انسان فوراً اس امر کو جان سکتا ہے کہ یہ قوم عیش و تنعم کی پرستار ہے اور اس کا مرکز و محور دنیاوی فوائد و لذائذ کا حصول ہے، اس کے دل میں نفس پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ یہ ملک بوس محلات قومی ترقی کی شہادت نہیں دیتے بلکہ قرب قیامت کی دہائی دے رہے ہیں"

ہماری زندگی کے اس شعبہ کے متعلق یہ دو متضاد اور متناقض آراء و حقیقت اس وسیع ذہنی کشمکش کا نتیجہ بنے جس میں اس وقت پوری قوم گرفتار ہے اور یہی چیز وہ اصل بیماری ہے جو ہماری قوم کی فکری اور عملی قوتوں کو گھن کی طرح اندر ہی اندر سے کھا رہی ہے۔ سب سے بڑی بد قسمتی یہی ہے کہ ہم نے آج تک پورے اخلاص اور یکسوئی سے اس امر کا

فیصلہ نہیں کیا کہ ہمیں کدھر جانا ہے اور ہم کس سمت بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ قوم کے درمند کبھی تو اس صورت حال کو دیکھ کر قوم کو کوستے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس قوم کی ساری تعمیری صلاحیتیں ختم ہو گئی ہیں اور کبھی غیر ملکی سامراجی طاقتوں کو ہدف طعن بناتے ہیں لیکن عقل یہ ماننے پر تیار نہیں ہوتی کہ وہ قوم جو گزشتہ بارہ سو برس سے مختلف قسم کی گمراہیوں کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کرتی چلی آ رہی ہو اور جسے اس معاملہ میں نہ تو غیروں کی تہمانیاں اور دعا بازیاں اصل مقصد سے باز رکھنے میں کامیاب ہوئی ہوں اور نہ اپنوں کی چالاکیاں اور عیاریاں جاوہ مستقیم سے ہٹا سکی ہوں، وہ قوم گزشتہ چودہ سال کے قلیل عرصے میں بے شعور اور بے حس جانوروں کا ایک گلہ بن کر رہ جائے جسے ذاتی اغراض بالکل میکاکی طور پر جس طرف چاہیں ہانک کر لے جائیں۔

ہمارے نزدیک قوم کے اندر اس ذہنی خلفشار کی اصل وجہ وہ شدید احساسِ ناکامی ہے جو پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا ہے۔ ہماری حالت قرآن مجید کی اس مثیلی بڑھیا کی سی ہے جو بڑی محنت اور مشقت کے بعد سوت کا نتیجہ ہے مگر پھر اُسے خود اپنے ہی ہاتھوں سے تازا کر دیتی ہے۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد جب غیر ملکی سامراج نے ہم پر عرصہٴ حیات تنگ کر دیا تو ہمارے اندر یہ شعور بیدار ہوا کہ ہماری یہ سیاہ بختی ہماری اپنی بد اعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ ہم نے جس وقت سے اسلام سے منہ موڑا ہے اسی لمحہ سے ہم مختلف قسم کے مصائب کا شکار ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ہماری بربادی ذلت اور خواری کی اصل وجہ خدا سے بے تعلقی اور اس کے احکام سے روگردانی ہے۔ یہ ہماری دین سے غفلت کا نتیجہ ہے کہ جس خطہٴ ارضی پر ہم سات سو سال تک حکمراں رہے وہاں ہم محکوم و مغلوب بن کر رہ گئے ہیں۔ اس احساس نے مسلم قوم کو ایک نیا شعور اور ولولہ بخشا اور اس نے اسلامی آرزوؤں اور تمناؤں کے دیسے جلا کر اُس کی روشنی میں ایک نئی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس جدوجہد

کاسبے پہلا نتیجہ بالاکوٹ کے میدان میں رونما ہوا جہاں حضرت شاہ اسماعیل شہید اور ان کے جلیل القدر رفقاء کار کو شہادت نصیب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے، اس کے بعد اسی احساس نے ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف صف آرا کر دیا پھر یہی احساس تحریکِ خلافت میں پوری طرح کار فرما رہا اور بالآخر اسی احساس کے تحت مسلم عوام نے پاکستان کا مطالبہ کیا اور اس کے حصول کے لیے ایسی زبردست قربانیاں دیں جن کی نظیر قومی جدوجہد میں بہت کم ملتی ہے۔ خواب و خیال کی دنیا میں رہنے والے جو چاہیں کہتے رہیں کہ پاکستان کو صرف ایک مدبر کے ناخن تدبیر نے جنم دیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس تدبیر کے ساتھ اگر ہندوستانی مسلمان اپنی جان و مال اور عزت و آبرو تک لٹانے کے لیے تیار نہ ہوتے تو پاکستان کا خواب ساری تدبیروں اور ہنرمندیوں کے باوجود خواب ہی رہتا۔ شرمندہ تعبیر نہ ہوتا۔ یہ صرف اسلامی نظام کا نعرہ ہی تھا جس کی کشش نے امت مسلمہ کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنی قیمتی سے قیمتی متاع اس جدوجہد میں جھونک دے۔ کیا مسلمانوں کو اس بات کا علم نہ تھا کہ انتقالِ آبادی میں ان کو کس قسم کی مصیبتیں پیش آئیں گی اور سکھ اور ہندو ان کے ساتھ کس قسم کا وحشیانہ سلوک کریں گے کیا ان چار کروڑ مسلمانوں کو جو ہندو اکثریت کے علاقہ میں آباد تھے اپنا حشر معلوم نہ تھا؟ کیا انہیں اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے تہذیبی ورثہ ان کی مساجد اور ان کے مقدس مقامات کے ساتھ متعصب اور تنگ نظر اکثریت کس قسم کا شرمناک رویہ اختیار کرے گی۔ حملات میں رہنے والوں اور صرف ایوانوں میں بحث مباحثہ کرنے والوں کی آنکھوں سے یہ حقائق اوجھل ہوں تو ہوں لیکن معمولی سوچ بوجھ رکھنے والا ہر مسلمان ان خوفناک نتائج سے پوری طرح آگاہ تھا۔ لیکن جانتے ہوئے بھی اُس نے پاکستان کی طرف اس لیے حمایت کی کہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ میں دنیا میں رہوں یا نہ رہوں مگر اس خطہ پاک میں اُس کی دینی تمناؤں اور روحانی آرزوؤں کی تکمیل بالضرور ہوگی۔

مملکت کے قیام تک تو وہ بے خطرہ کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتا رہا، برآفت کو جرأت و مردانی سے برداشت کرتا رہا مگر جب ملک فی الواقع معرض وجود میں آگیا تو اُس نے محسوس کیا کہ اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل ہونے کی بجائے اُن کا یہاں خون کیا جا رہا ہے توقعات کے جو خواب اور امیدوں کے جو خاکے اُس نے اپنے قلب و دماغ میں بنا رکھے تھے، اور جن کی اثر آفرینی کے تحت اُس نے آگ اور خون کے سمندر میں سے گزرتا تک گوارا کیا، وہ آہستہ آہستہ اُسے ٹٹتے ہوئے نظر آتے۔ اُس کی حالت اس بد نصیب انسان کی سی ہے جسے پیاس نے سخت پریشان کر رکھا ہو، اور وہ ترق و دق صحرا میں دُور سے پانی کا چشمہ اُلٹا ہو یا دیکھے مگر جب انتہائی محنت و مشقت اٹھانے کے بعد وہ اس چشمہ تک جا پہنچے تو اُسے معلوم ہو کہ یہ تو محض ریت کے چمکتے ہوئے ذرے ہیں جو پانی کی شکل میں اُس کے سامنے جھللا رہے ہیں۔

آپ آج کسی محب الوطن مسلمان کے دل کو ٹٹول کر دیکھیے تو آپ اسی قسم کا احساس شکست اُس کے دل کی گہرائیوں میں چھپا ہوا پائیں گے۔ یہ احساس قوموں کی زندگی میں موت اور بربادی کا پیغام ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قوم کے اندر ساری تخلیقی قوتیں ختم ہو گئی ہیں اور اُس کے سامنے سوائے کام و دہن کی لذت کے اب کوئی اور نچا مقصد باقی نہیں رہا۔ پھر اس احساس کے پرورش پانے کے ساتھ ہی اس کے اندر وہ جذبہ سرد و ٹپچاتا ہے جو اُس کے مختلف افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم کاب ہو کر چلنے کا سبق دیتا ہے۔ اس جذبہ کے منفقود ہوتے ہی ایثار، ہمدردی، جرأت و شجاعت، حق گوئی و بے باکی جیسی بلند صفات بھی ٹٹنے لگتی ہیں اور وہ قوم قوم نہیں رہتی بلکہ انسانوں کی ایک ایسی بھیر بن جاتی ہے جس کا ہر فرد خود غرضی، بے یقینی، عدم اعتماد اور نفس پرستی جیسی خوفناک بیماریوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ معاشرے کے اندر بھائی بھائی سے اُلجھتا ہے، حاکم محکوم سے دست گریب

ہونا ہے، امراد غربا پر دستِ ظلم دراز کرتے ہیں اور غربا امراد کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں۔ الغرض ذہنی اعتبار سے اس شکست خوردہ سوسائٹی کا کوئی فرد ایسا نہیں ہوتا جیسے وحانی اور سبحانی طور پر کوئی سکون حاصل ہو۔ انسانی قلب و دماغ کے ہر گوشہ میں اور معاشرے کے ہر طبقے میں ایک ایسا اختلال پیدا ہو جاتا ہے جو دنیا میں اُسے کسی کام کا نہیں چھوڑتا۔

اسے اہل پاکستان کی بد نصیبی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس احساسِ شکست جیسے خوفناک رجحان کا نہ صرف یہاں آغاز ہوا بلکہ اُسے بڑھانے اور ترقی دینے کے لیے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلسل انتظامات ہوتے رہے ہیں۔ اگر اہل ملک کو پہلے دن ہی دانشگاہ الفاظ میں بتا دیا جاتا کہ پاکستان کو جو احیائے اسلام کا ذریعہ بتایا گیا تھا یہ محض ایک سیاسی نعرہ تھا جس سے وقتی طور پر قائدہ اٹھانا مقصود تھا سو وہ حاصل ہو گیا ہے۔ اب ہمیں ملک کی تعمیر انہیں خطوط پر کرنی ہے جن خطوط پر مغربی قوموں نے کی ہے۔ اسلامی نظام محض قصہ پارینہ ہے آج کے روشن دور میں یہ کبھی رہنما قوت نہیں بن سکتی۔ تو اس صاف گوئی سے اُن بے چاروں کے سامنے اصل عزائم کھل کر آجاتے اور وہ ایک مرتبہ سوچ سمجھ کر اپنے مستقبل کا فیصلہ کر لیتے۔

— ان کے اندر بے یقینی اور عدم اعتماد کی وہ وبا تو بھپکتی جو اس وقت اُن کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔ یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ جو گروہ بھی برسرِ اقتدار آتا ہے وہ پہلے اسلامی نظام کی برکات بیان کرتا ہے پھر اس امر کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس ملک میں سوائے اس نظام کے کوئی دوسرا نظام کامیاب نہیں ہو سکتا لہذا اسی نظام کو ہی اس خطہ میں بالادستی حاصل ہونی ہے۔ جب لوگ اس قسم کی خوش کن باتیں سنتے ہیں تو ان کے شکستہ عزائم میں پھر سے زندگی کے آثار پیدا ہوتے ہیں اور اُن کے لپٹت حوصلے پھر بلند شروع ہوتے ہیں مگر جب وہ حقائق کی دنیا میں جھانک کر دیکھتے ہیں تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام کو برپا کرنے کے

یہ کچھ بھی نہیں کیا جا رہا اور قومی تعمیر اور ترقی کے وہی منصوبے بناتے جا رہے ہیں جو مغربی اقوام کے پیش نظر ہیں۔ اسلامی نظام کے متعلق یہ زبانی دعوے اور عملی اعتبار سے انحراف لوگوں کے اندر بار بار شکست کا احساس پیدا کرتے ہیں اور اب اس احساس کے قنوطیت اور ملکی مسائل میں عدم دلچسپی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ اہل ملک کے دلوں سے ملک کے سود و زیاں کا احساس آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے اور ان کے کان اب ہر دعویٰ کو محض ایک کھوکھلے نعرے کی حیثیت سے سننے کے عادی ہو گئے ہیں۔

لوگ جب ملک کی کسی صاحب اقتدار مہتی کی زبان سے یہ سنتے ہیں کہ یہاں اسلام ہی برپا ہو گا تو وہ بجا طور پر اس چیز کی توقع رکھتے ہیں کہ اس ملک کا نظام حیات جن بنیادوں پر قائم ہے ان میں آہستہ آہستہ تبدیلی کی جائے گی۔ غیر مسئول اقتدار کی جگہ خدا کی حاکمیت قائم ہوگی۔ امیر اور غریب، گورے اور کالے کے درمیان جو مصنوعی دیواریں حائل ہیں وہ منہدم ہونگی۔ دولت کی غیر عادلانہ تقسیم کی بجائے ہر فرد اور طبقہ کو اس کا جائز حق ملے گا اور کوئی شخص بھی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہ ہوگا۔ معاشرتی زندگی نہایت پاکیزہ اصولوں پر مرتب ہوگی اور خانگی اور عائلی زندگی ہر قسم کی کشاکش اور غم و غصہ سے پاک ہوگی۔ پڑوسی اپنے پڑوس سے بالکل بے خوف ہوگا۔ حسین سے حسین اور نوجوان سے نوجوان خاتون معاشرے میں اس طرح مامون زندگی بسر کرے گی کہ غیر مرد کا طائر و سوسہ بھی اس کے حرم عصمت کی طرف پرواز نہ کر سکے گا۔ ملک میں راستبازی، حق گوئی، نیکی اور بہنیزگاری کا عام حلین ہوگا اور پرانی اپنی ہر شکل میں یہاں سے مٹا دی جائے گی۔ اسلامی نظام حیات کا نام سن کر یہ وہ عام توقعات ہیں جو بالکل فطری طور پر ہر مسلمان کے دل و دماغ میں پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک طرف تو زبانی دعووں سے مستقبل کے متعلق یہ بلند توقعات ایستہ کی جاتی ہیں اور

دوسری طرف انہیں توقعات کو زندگی کے ہر میدان میں عملاً جھٹلایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب امت مسلمہ یہ سنتی ہے کہ اس ملک کی معاشی زندگی اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالی جائے گی تو وہ یہ سوچنے میں ہر لحاظ سے حق بجانب ہوتی ہے کہ اب ملک میں ایک ایسا معاشی نظام پروان چڑھیکا جو اشتراکیت اور سرمایہ داری کی لعنتوں سے یکسر پاک ہوگا۔ اس بنا پر پہلا احساس جو ہر فرد کے ذہن میں بالکل فطری طور پر ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں بالکل مصنوعی طریق سے دولت کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی ہے وہ کم ہوگی اور زرو مال کو یہاں فی الواقع وہی مقام دیا جائے گا جس کا اُسے اسلام میں متحق قرار دیا ہے۔

دور جدید میں بقول جٹو انسانی روح صرف دولت و ثروت کے پیمانہ سے ناپی جاتی ہے، کیونکہ آج کا رب اکبر صرف ڈالر ہے۔ اس بنا پر معاشی میدان میں ہر شخص کا کعبہ مقصود ایک ہی ہے کہ وہ حلال و حرام، جائز و ناجائز کی قیود سے یکسر آزاد ہو کر زیادہ سے زیادہ کمانے کی فکر کرے اور پھر اس سے زیادہ سے زیادہ دنیاوی فوائد حاصل کرے۔ یہی انداز فکر اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں کے اندر کار فرما ہے۔ اس نقطہ نظر کے برعکس اسلام زرو مال کی محبت کو آزمائش سے تعبیر کرتا ہے اور انسان کو یہ بنیادی حقیقت ذہن نشین کراتا ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے وہ بلاشبہ تمہاری خدمت و چاکری کے لیے ہے اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانا چاہیے مگر تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔ پھر قرآن مجید دورِ حاضر کی اس غلط فہمی کو بھی دور کرتا ہے کہ دولت مطلقاً الحاقاً ہے کہ اس سے انسان کی ساری حاجتیں پوری ہو جائیں اور یہ کوئی ایسی پائیدار چیز ہے کہ اس پر ہمیشہ کے لیے تکیہ لگایا جاسکے۔ نقطہ نظر کی اس بنیادی تبدیلی کے ساتھ ایک انسان بالکل صحیح طور پر اس بات کی توقع رکھتا ہے کہ جس معاشرے نے زر پرستی کی بجائے خدا پرستی کو اپنا اساسی اصول قرار دیا ہے اس میں دولت کمانے کے لیے وہ غیر مصممندانہ نیت اور رقابت نہیں ہوگی جو اس وقت ہمارے ہاں موجود ہے۔ پھر یہ نیا نظریہ ملت کو

نئی اقدار حیات عطا کرے گا جن میں ثمرات اور عزت کا معیار بنک بیلنس، کوٹھیوں اور کاروں کی بجائے تقویٰ اور پرہیزگاری قرار پائے گا اور اسی کے مطابق ہر فرد کا سوسائٹی میں مرتبہ اور مقام مشخص ہوگا۔ دولت چند افراد یا ایک مخصوص طبقہ میں سکڑنے کی بجائے پوری سوسائٹی میں انصاف کے ساتھ تقسیم ہوگی اور اس طرح ہر قسم کے استحصال اور جائز نفع اندوزی راستے مسدود ہونگے۔ اسلامی نظام معیشت کے یہ وہ قدرتی نتائج ہیں جو لازمی طور پر کچھ عرصہ کے بعد رونما ہونے چاہیں۔ لیکن اگر ایک گروہ دعوتے تو اسلامی نظام معیشت کا کورے لیکن سوسائٹی کا سارا ڈھانچہ سرمایہ دارانہ اصولوں کے مطابق چلتا رہے۔ ملک میں دولت کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہے، جائز و ناجائز کی ان پابندیوں کو قطعاً نظر انداز کر دیا جاتے جو اسلام نے دولت کمانے اور صرف کرنے پر عائد کر رکھی ہیں، سود جو ارتکاز دولت کا سب سے موثر ذریعہ ہے وہ ملک کے پورے معاشی نظام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت سے شامل رہے۔ امیر اور غریب کے درمیان زبردست تفاوت پایا جائے۔ ملک کی بیشتر دولت پر ایک مختصر سا طبقہ دادِ عیش دیتا رہے اور عظیم اکثریت نانِ شبینہ تک سے محتاج ہو۔ ایک طرف سرفیلک عمارات تعمیر ہو رہی ہوں اور دوسری طرف لوگوں کو سر چھپانے تک کے لیے جگہ نہ ملے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر کون شخص یہ باور کر سکے گا کہ اس ملک میں اسلامی نظام معیشت کی راہ ہموار کی جا رہی ہے۔ اگر وہ دین کا تھوڑا سا علم بھی رکھتا ہے تو وہ یہ سمجھے گا کہ اسے محض اسلام کے نام پر دھوکا دیا جا رہا ہے اور اگر وہ علم دین سے بے بہرہ ہے تو وہ اس دین ہی کو تباہ دے گا جو انسانوں کے درمیان اس قسم کی غیر عادلانہ تقسیم کو روا رکھتا ہے۔ یہ دونوں احساسات ملکی ترقی کے لیے کوئی نال نیک نہیں کہے جاسکتے۔

اسی طرح یہی ذہنی خلفشار ملک کے دستور و آئین اور اس کی سیاسی ہیئت کے متعلق ہر قدم پر پیدا ہو رہا ہے۔ ہمیں بار بار یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ملک کا دستور و آئین

اسلامی ہوگا۔ یہ ایک ایسا وعدہ ہے جس سے قوم کی مردہ تہذیبوں میں بار بار زندگی کی لہر دوڑتی ہے۔ اور وہ پھر ایک بہتر اور روشن مستقبل کا خواب دیکھنا شروع کرتی ہے۔ وہ احساسِ ناپا جو گزشتہ چند سال کی وعدہ خلافیوں نے اُس کے اندر پیدا کر رکھا ہے۔ اُس کے اثرات بھی آہستہ آہستہ زائل ہونے لگتے ہیں لیکن ابھی وہ اس انداز پر سوچنا ہی شروع کرتی ہے کہ اُس کے کان میں عجیب و غریب آوازیں آنے لگتی ہیں کبھی وہ سنتی ہے کہ اسلام کے غیر تبدیل اصول و دستور کی اساس ہو گئے، کبھی اسے کہا جاتا ہے کہ اسلامی روح دستور میں کارفرما ہوگی کبھی اُسے یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن کی اٹل اور ابدی تعلیمات دستور کی بنیاد قرار پائیں گی کبھی اُس کے سامنے اس امر کا انکشاف کیا جاتا ہے کہ دستور رجعت پسندانہ نہیں ہوگا بلکہ دورِ حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق ہوگا۔ یہ بھانت بھانت کی بولیاں سن کر قوم کے قلب و دماغ میں پھر شکستگی کے آثار اُبھر آتے ہیں۔ اُس کے ذہن میں بالکل بجا طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان وعدوں میں قرآن مجید کی غیر تبدیل تعلیمات کا تو ذکر ہے لیکن سنت جو قرآن مجید کے بعد اسلامی دستور کی سب سے محکم بنیاد ہے، اسے کیوں نظر انداز کر دیا گیا ہے اور خاص طور پر جب حکمران طبقہ کے کچھ لوگ کھلے بندوں سنت کے خلاف اظہارِ خیال شروع کر دیں تو لوگوں کے دلوں میں دستور کی اسلامی حیثیت کے بارے میں شکوک و شبہات کا پیدا ہونا بالکل ایک فطری امر ہے۔ پھر ان شکوک کو برسرِ اقتدار طبقہ کے بعض انتہائی ذمہ دار افراد کے مختلف بیانات بھی مسلسل غذا فراہم کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ جب یہ سنتے ہیں کہ مذہب انسان کی خدمت و چاکری کے لیے پیدا کیا گیا ہے نہ کہ انسان مذہب کے بندھنوں میں گرفتار ہونے کے لیے تو وہ یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ملک کی تعمیر جدید میں دین کی حیثیت رہنما قوت کی نہ ہوگی بلکہ تابع مہل کی سی ہوگی جس کا کام حکمرانوں کی تہذیبوں اور خواہشات کی بلاچون و چراپیروی کرنا ہوگا۔ پھر اسلام کے غیر تبدیل اصول اور اسلامی روح کا بھی جس انداز سے ذکر کیا جاتا ہے اُسے بھی کسی موثر مند انسان کے قلب و دماغ کو کیسوی

اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا بلکہ مزید اضطراب اور تردد پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے توسارے احکام غیر تبدیل اور ابدی ہی ہیں پھر یہاں ان کے اندر کس بنا پر تفریق کی جا رہی ہے۔ کیا اس تخصیص کا مقصد کہیں یہ تو نہیں کہ جو اصول مغربی افکار و تصورات کے مطابق نظر آتے انہیں تو قبول کر لیا جاتے اور باقی اصولوں کو تغیر پذیر فرودعات کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ اگر ہمارے پیش نظر اسلام کو ہی ملکی دستور کی اساس اور بنیاد بنانا مقصود ہے تو پھر اس امر کا کیوں نہیں صاف صاف اعتراف کر لیا جاتا کہ ملک کا دستور قرآن و سنت کے مطابق ہوگا۔ اتنی سیدھی اور واضح بات کو اتنے اچھوچھو کے ساتھ میدان کرنے کی مصلحت ایک عام مسلمان کے ذہن میں کبھی نہیں آسکتی۔

سیاسی میدان سے ہٹ کر ہم جب معاشرتی دائرہ میں نظر ڈالتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں نگر و عمل کا یہی تضاد ہر جگہ دکھائی دیتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اس اندوہناک حقیقت کو بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے کہ اسلامی نظام کے بلند بانگ دعووں کے باوجود اقدار حیات طے نہیں کر پاتے۔ ملک کے اندر شراب خوری، حرام خوری، زنا، فحاشی، رشوت کا بازار گرم ہے لیکن ہم ان برائیوں کو مٹانے کے لیے اتنے مضطرب نہیں جتنے کہ ہمیں فی الواقع ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہم ان برائیوں کو ان نگاہوں سے ابھی تک دیکھنے کے عادی نہیں ہوتے جن سے اسلام انہیں دیکھتا ہے۔ ہمارے ذہنی پس منظر میں یہ برائیاں اسی حد تک ناپسندیدہ ہیں جس حد تک کہ اہل مغرب انہیں قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔ جب امتناع شراب کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو اس پر غور و فکر کرتے ہوتے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسے عملی جامہ پہنانے سے ہمیں کس قدر مالی خسارہ ہوگا یا ہماری اس روش سے کتنے غیر ملکی لوگ ہم سے ناراض ہوں گے۔ ایک ایسی برائی جسے اسلام انتہائی نفرت کے ساتھ دیکھتا ہے اور جس کا وجود اسلامی معاشرہ میں ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کیا جاسکتا اس سے

اگر ہم مادی منفعت وابستہ کر لیں اور اس مسئلہ پر مادی سود و زیاں یا چند غیر ملکی افراد کی ناراضگی کے نقطہ نظر سے غور کرنا شروع کر دیں تو یقیناً اس کے بارے میں ہمارے احساسات میں وہ شدت باقی نہ رہے گی جس کا اسلام ہم سے متقاضی ہے۔ ہم اسے ایک قابلِ برواقت ناپسندیدہ فعل سمجھتے ہوئے اس سے انغماض برتنے چلے جائیں گے اور جلد ہی مجبور یوں کے نام پر اس ناپاک کاروبار کو بڑھنے اور پھیلنے پھولنے کے خود مواقع فراہم کریں گے۔ قریب قریب یہی حال زنا کا ہے کسی اسلامی مملکت کے لیے اس سے زیادہ شرمناک کوئی بات نہیں کہ اس کے لینے والے اس خوفناک برائی کا ارتکاب کریں۔ اسلام کے نزدیک یہ قتلِ انسان سے زیادہ سنگین جرم ہے جس کی شریعت اسلامی میں انتہائی عبرتناک سزا مقرر کی گئی ہے۔ لیکن دیکھیے کہ اسلام کے ساتھ محبت اور عقیدت کے اظہار کے باوجود ہم اس برائی کے بارے میں کس نوعیت کے احساسات رکھتے ہیں۔ وہ برائی جس کی سزا اسلام نے سنگسار کرنا مقرر کی ہے اسے اگر چند اوباش اور آوارہ لوگ حکومت جیسے لائسنس حاصل کر کے فروغ دیں تو اس کا کوئی مواخذہ نہیں کیا جاتا۔ اور اگر یہ جرم لائسنس کے بغیر کیا جائے تو پھر وہ کسی قدر قابلِ گرفت ہے۔ آپ آج کوئی اخبار اٹھا کر دیکھ لیں تو آپ کو کالم کے کالم اس گھناؤنے جرم سے بھرے ہوتے ملیں گے کیا انہیں دیکھ کر ہماری غیرت کو وہی تازیانہ لگتا ہے جو فی الواقع لگنا چاہیے۔ ہمارے اس بد نصیب معاشرہ میں روزانہ کتنی بے بس عورتیں غنڈے اور بد معاش لوگوں کے ہاتھوں اغوا کی جاتی ہیں اور پھر ان پر جو بیہوشی ہے اس کے تصور سے بھی جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اس کے تدارک کے لیے بیشک حکومت کچھ نہ کچھ کر رہی ہے۔ کہیں پکڑو حکمہ کا سلسلہ ہے، کہیں چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ کہیں ایسے مجرموں کو عدالتوں کے ٹیڑھوں میں کھڑا کیا جا رہا ہے لیکن اس معاملہ میں بھی دیکھنے کی چیز وہی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، یعنی اس جرم کی سنگینی کو ہم اس شدت سے محسوس کر کے اس کے مطابق عمل نہیں کر رہے جس کا کہ اسلام ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔ حقیقت ہمارے احساسات بدل گئے ہیں ہم اسے اسی طرح کی چھوٹی موٹی برائی سمجھتے ہیں جس طرح کہ دوسری

برائیاں ہیں۔ اگر سرحدوں کی حفاظت حکومت کا فرض ہے تو اس سے کہیں زیادہ اہم فرض لوگوں کی عفت اور عصمت کی پاسبانی کا بھی ہے۔ ایک اسلامی ریاست اس فرض کے معاملے میں اتنی ہی حساس ہونی چاہیے جتنی کہ وہ ملک کے قیام اور بقا کے معاملے میں ہوتی ہے اور جو افراد ملک کے اندر عفت کے قلعوں کو مسمار کرنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں وہ ان باغیوں سے کسی طرح کم نہیں جو ناپاک عزائم کے ساتھ ملک کی سرحدوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ایک مسلمان کے اس معاملے میں جذبات کتنے نازک ہوتے ہیں اُس کا اندازہ حجاج بن یوسف جیسے ظالم حکمراں کے طرز عمل سے لگایا جاسکتا ہے۔ حجاج کے عہد میں حکومت اُن فرائض کو کما حقہ ادا نہ کر رہی تھی جو اسلام نے اُس پر عائد کیے ہیں۔ خود حجاج بھی کوئی خلفائے راشدین کی طرح کا کوئی خلیفہ راشد نہ تھا، ایک آمر اور مستبد فرمانروا تھا لیکن اُسے جب اس بات کا علم ہوا کہ اُس کی قوم کی چند بیٹیاں ظالموں کے زرخے میں ہیں تو اُس نے فوراً ایک لشکر جرار اُن کی بازیابی کے لیے روانہ کر دیا اور اُس وقت تک چین سے نہ بیٹھا جب تک کہ انہیں آزاد کر کے محرموں کو کفیفر کر دیا تک پہنچا دیا۔

پھر آپ اس امر کا بھی جائزہ لیں کہ اگر ہم زنا، شراب، فحاشی اور بدکاری کا کافی ان واقعہ پاکستان میں استیصال کرنے کا عزم رکھتے ہیں تو کیا مثبت طور پر بھی ہم اس سلسلہ میں انتہا کام کر رہے ہیں جس کا یہ کام مستحق ہے۔ یہ ساری برائیاں کسی معاشرے میں یونہی نہیں پھیل جاتیں ان کی پشت پر زبردست محرکات کار فرما ہوتے ہیں جو انسان کے قلب و دماغ کو اس طرف لگاتے ہیں۔ نکاح پر ناروا قسم کی پابندیاں، مردوں اور عورتوں کا آزادانہ میل جول، بے حجابی، رقص و سرود کی مجالس کا انعقاد، آرٹ اور شعر کے نام پر سفلی جذبات کی تسکین۔ یہ وہ چھوٹے چھوٹے "معصوم" فتنے ہیں جن سے ان بُری برائیوں کو قوت و طاقت فراہم ہوتی ہے۔ اگر ان بُری برائیوں کو مٹانا مقصود ہے تو پھر ہمارے لیے کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم ان چھوٹے چھوٹے فتنوں کو ابھارنے کی بجائے انہیں مٹانے کی فکر کریں۔ لیکن اس وقت ملک میں صورتِ حال

یہ درپیش ہے کہ ہم ان چھوٹے چھوٹے فتنوں کو "ترقی" کے نام پر پالتا بھی چاہتے ہیں اور ان کے نتیجے میں جو برائیاں پروان چڑھ رہی ہیں انہیں ختم کر دینے کے بھی مہمتی ہیں۔ دنیا میں اس سے زیادہ سادہ اور بیوقوف کو نسا شخص ہوگا جو اپنے مکان کو نذرِ آتش بھی کرے اور پھر اس بات کا بھی خواہشمند ہو کہ اس کی عمارت اور اس کے اندر جو مال و متاع موجود ہے وہ سب محفوظ رہے۔

ہمارے اندازِ فکر کی بنیادی خامی وہی ہے جس کا ہم نے آغاز میں ذکر کیا تھا کہ ہم آج تک اس بات کا فیصلہ نہیں کر پاتے کہ ہماری منزل مقصود کیا ہے۔ اگر ہم اپنے مقصد کے بارے میں کیسے سوچتے تو ہمیں فکری اور عملی اعتبار سے وہ وقتیں پیش نہ آتیں جو اس وقت پیش آرہی ہیں مقصد کے یقین ہی سے زندگی میں ترتیب و تنظیم پیدا ہوتی ہے اور اس سے انسانوں کی خفقت قوتیں بیدار ہوتی ہیں۔ مقصد ہی انسانوں کو زندگی اور اس کے معاملات کے بارے میں ایک خاص اندازِ فکر عطا کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کی زندگی کے مختلف شعبوں میں ہم رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے طے ہوتے ہی اس کے بعد پھر اس شخص کی ساری فکری و عملی قوتیں ایک مرکز پر جمع ہوتی ہیں اور سب سے بڑھ کر مقصد ہی کسی معاشرہ کے اندر اقدارِ حیات کی تخلیق کرتا ہے۔ ایک انسان یا سوسائٹی اپنے گرد و پیش میں پھیلے ہوئے افکار و تصورات، یا افعال و اعمال یا مختلف حالات و واقعات پر جو نیک و بد، محمود و مذموم کا حکم لگاتی ہے تو اس کے لیے قوی مقصد کی بارگاہ ہی سے جاری ہوتا ہے۔ یہ اقدار کسی سوسائٹی کے بقا، استحکام اور ترقی کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ نہ صرف انسان کے فکری سانچوں کو ایک خاص طرز پر ڈھالتی ہیں بلکہ اس کے احساسات و جذبات کی بھی ایک نیچ پر پرورش کرتی ہیں۔ اس سے انسان اور معاشرہ کے اندر فکری اور عملی خلفشار ختم ہوتا ہے اور اس کی قوتیں ایک خاص راہ پر صرف ہونا شروع ہوتی ہیں۔ کسی قوم کا مستقبل متعین کرنے میں، اس کی ترقی اور فلاح و کامرانی کے منصوبے بنانے میں اس کی تطہیر میں یہ اقدار اساسی اہمیت کی حامل ہیں۔ وہ قوم جس نے اپنے

اندر اقدار حیات کی پورے طور پر نشوونما نہیں کی اُس کی حیثیت اُس بے لنگر جہاز کی سی ہے جسے فکر و نظر کے ٹھپیڑے جس طرف چاہتے ہیں بہا کر لے جاتے ہیں۔ وہ فاصلے تو بہت طے کرتا ہے لیکن منزل مقصود کو حاصل کرنے میں ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔

ہمارے سامنے آج سبکے اہم مسئلہ یہی ہے کہ ہم خلوص اور ایمان داری کے ساتھ اپنی منزل کا تعین کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے مطالبہ کے وقت سے لیکر آج تک ہم مسلسل ہی دہرتے چلے آئے کہ ہمیں اس ملک کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانا ہے، یہاں صرف اسلامی نظام کو نافذ کرنا ہے لیکن اس افسوسناک حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارا عمل ہمارے ان دعوؤں کی تائید نہیں کرتا۔ اگر اسلام فی الواقع ہماری منزل مقصود ہوتا تو آج ہماری جدوجہد کا رخ کچھ اور ہوتا۔ معاشی ترقی اور خوشحالی کے لیے آج کتنے منصوبے بن رہے ہیں اور انہیں عملی جامہ پہنانے کے لیے قوم سے کس قدر محنت اور کتنے سرمایہ کا تقاضا کیا جا رہا ہے لیکن ان معاشی منصوبوں کی نسبت آجھی یا چوتھائی قوم یا محنت بھی اخلاقی منصوبوں کی ٹیکے کی طرح کی گئی ہے اس معاملے میں ہم کیوں اتنے بے حس ہیں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہماری نظر میں معاشی استحکام اخلاقی استحکام کی نسبت بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ حالانکہ کسی اسلامی معاشرہ میں اگر ان دو کے درمیان کبھی تفریح کا مسئلہ پیدا ہو جاتے تو اولیت کا شرف ہمیشہ اخلاق کو ہی حاصل ہو گا۔ ہم کسی ایسے معاشی استحکام کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو اخلاقی حدود و فریود کو نظر انداز کر کے حاصل کیا گیا ہو۔ اسلام دنیا کی ایک اخلاقی اور روحانی قوت ہے اور اس لیے ایک مسلمان جب تک کہ وہ مسلمان ہے ہر چیز کی قدر و قیمت اخلاقی اور روحانی معیار کے مطابق طے کرتا ہے۔ اس بنا پر خوشحالی اور بدحالی، ترقی اور تنزل کے ہمارے اپنے الگ پیمانے ہیں اور جن کے مطابق ہی ہم اپنے منصوبوں اور پروگراموں کی قدر و قیمت کا صحیح طور پر اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر صنایع تولید یورپی اقوام کی نظر میں معیار زندگی بلند

کرنے کا ایک مجرب اور آسان نسخہ ہے لیکن ہمیں اس نسخہ کو آزمانے سے پہلے اس کے معاشی فوائد سے زیادہ اس کے اخلاقی مفاسد کا بھی جائزہ لینا ہے کیونکہ اگر یہ بالفرض ایک طرف ہمارا معیار زندگی بلند کرنے کا ذریعہ بھی ثابت ہو جائے لیکن دوسری طرف جو ہمارے نزدیک زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ یہ ایسی اخلاقی بیماریوں کو جنم دے گا جو ہماری نظر میں اس غربت اور افلاس سے کہیں زیادہ خوفناک ہیں جن سے ہمیں اس وقت خوف زدہ کیا جا رہا ہے۔ ایک مسلمان کے ہاں ہر عمل کی اخلاقی حیثیت اس کی دوسری تمام حیثیتوں سے زیادہ وزنی ہے اور اس سے ہم کسی حالت میں بھی صرف نظر نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ایسی بنیادی حقیقت ہے جو اس ملک کے کسی بھی خواہ کی نظر سے کبھی بھی اوجھل نہ ہوتی چاہے کیونکہ اس کے اوجھل ہونے سے ہی ہمارے اندر فکر و عمل کا انتشار پیدا ہو رہا ہے جس سے گزشتہ چودہ سالوں میں ہمیں کافی نقصان پہنچا ہے۔ ہم اس بات کو حقیقی جلدی ذہن نشین کر لیں یہ اتنی ہی ہمارے حق میں مفید اور کارآمد ہوگی۔